پروفیسر اینی میری شمل سے ایک گفتگو

[معروف جرمن فاضلہ پروفیسر اینی میری شمل مشرقی علوم اور اسلامی اُمور کی ماہر ہیں۔ اُن کا نام پاکستان کے علمی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ پاکستان اور یہاں کی روایات و ثقافت سے اُنہیں جو محبت ہے، وہ اُن کی تالیفات اور توسیعی لیکچروں سے عیاں ہے۔ جرمنی کے سفارت خانے کے جریدے "معلومات جرمنی" میں اُن کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں اُنہوں نے یورپ میں بڑھتی ہوئی مسلم آبادی اور اُس کے جُداگانہ تشخص، نیز احیائے اسلام کی سرگرمیوں کے حوالے سے سوالوں کے جواب دیے ہیں۔ انٹرویو جناب ایڈلبرٹ ریف نے لیا ہے جو ایک دو واقعاتی غلطیوں کی تصحیح کے ساتھ جریدہ مذکور کے شکریے کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ تاہم انٹرویو میں پیش کیے گئے خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ مدیر]

سوال: پروفیسر صاحبہ! یورپی ذرائع ابلاغ اسلام کو ایک سنگین خطرے کے روپ میں پیش کر رہے ہیں. آیا اسلام حقیقی خطرہ ہے یا محض تخیل کا کرشمہ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ (کوئی اور دشمن موجود نہ ہونے کی وجہ سے) ہم اپنے لیے کوئی نیا دشمن تخلیق کر رہے ہیں؟

پروفیسر شمل: جس طرح یورپی ذرائع ابلاغ پیش کر رہے ہیں، درحقیقت اس طرح کے "اسلامی خطرے" کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن میں اس خطرے کو خالصتاً تصوراتی بھی نہیں کہوں گی۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ازمنہ وسطیٰ سے اسلام کو مغرب اور عیسائیت کے دشمن کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ اس زمانے کے ایک مختصر دور میں مسلمانوں نے مسیحی دنیا کے وسیع علاقوں پر پے در پے حملے کر کے عیسائیوں کو صدمات سے دوچار کیا۔ دوسری بات یہ کہ اسلام کا ظہور، عیسائیت کے بعد ہوا۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ کفر ہے اس لیے اس کا وجود باقی نہیں رہنا چاہیے۔ یہ تصوّر ازمنہ وسطیٰ سے ۲۰ ویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔ ۱۵۲۹ء میں ترکوں کی طرف سے ویانا کا محاصرہ ستم بالائے ستم ثابت ہوا۔ اُس زمانے میں یورپ میں اسلام کو ترکوں کا مذہب سمجھا جاتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی ۱۶۸۳ء تک جرمن ادب میں اسلام مخالف جذبات غالب رہے۔ جرمن زبان میں ترکوں کے بارے میں نظمیں "Turken lieder" کے علاوہ اسلام کے خلاف بے شمار پمفلٹ اور ڈرامے لکھے گئے جن کی وجہ سے اسلام مخالف تصوّرات پختہ سے پختہ تر ہوتے گئے۔

سوال: کیا یہ کہنا درست ہے کہ اسلام ایک محدود اور بند نظام ہے ؟

پروفیسر شمل: اسلام کئی صدیوں میں پھیلا اور دور دور تک بڑی تعداد میں لوگوں تک پہنچا۔ اس لیے مختلف خطّوں میں اس میں ایک دوسرے سے قدرے مختلف رنگوں کا نہ جھلکنا بہت حیرت انگیز بات ہوگی۔ مثلاً کلفورڈ گیرٹز نے اپنی کتاب Islam observed میں مراکش اور انڈونیشیا میں پائے جانے والے فرق کی عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ مکاتب فکر اور فقہی مذاہب کے درمیان قرآن کی تعبیر و تشریح میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ عقاید میں کٹر اور راسخ العقیدہ ہیں تو کچھ لوگ تصوّف کے شیدائی ہیں۔ ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان بھی آگے چل کر مزید شاخیں نکلتی ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تمام عالم اسلام میں اسلام کی تعبیر و تشریح میں مکمل ہم آہنگی ہے۔

تاہم اگر ہم دیکھیں کہ اسلام کی اصل بنیاد کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی عمارت اس اعتراف کی بنیاد پر قائم ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ بالفاظ دیگر جو فرد علی الاعلان یہ اقرار کرتا ہے کہ "نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں"، وہ مسلمان ہے۔ یہ اقرار مسلمان ہونے کی کم سے کم شرط ہے۔ یہ اقرار کیے بغیر کوئی فرد مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے باقی چار ارکان روزانہ پانچ وقت کی نماز، ادائیگی زکوٰۃ، ماہ صیام میں روزے رکھنا، اور ہر صاحب استطاعت کے لیے زندگی میں کم از کم ایک بار حج کعبتہ اللہ۔ ان تمام فرائض کی ادائیگی مردوں اور عورتوں پر یکساں فرض ہے۔ عیسائیت کی طرح اسلام میں پوپ جیسی کسی مرکزی ہستی اور اتھارٹی کے احکامات کی پابندی لازمی نہیں ہے، البتہ کسی مسلمان کو کسی بھی حالت میں قرآن کے احکامات نہ ماننے اور ان پر اعتراض کرنے کا قطعاً اختیار حاصل نہیں۔ مسلمانوں کو اس بارے میں کوئی انتہائی معمولی ترین شائبہ بھی نہیں اور ان کا ایمان ہے کہ اوّل تا آخر قرآن کا ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے۔ قرآن پر اسی غیر متزلزل ایمان کے باعث مسلمانوں کو مغرب میں بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔

سوال: گزشتہ چند صدیوں میں مختلف بحرانوں نے عیسائیت کی بنیادیں ہلا دی ہیں جن میں دو قابل ذکر بحران، انقلاب فرانس اور سیکولرازم یا غیر مذہبیت ہے۔ کیا مستقبل میں اسلام کو بھی اس قسم کے بحرانوں کا سامنا کرنا پڑے گا ؟

پروفیسر شمل: یہ ایک مشکل سوال ہے۔ جب تک مسلمان اپنے اس عقیدے پر قائم ہیں کہ دنیا اور کائنات کی حقیقت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ (قضا و قدر) تقدیر کے تمام فیصلے صرف اللہ کرتا ہے، اُس وقت تک انقلاب فرانس یا کوئی بھی انسانی نظریہ، اسلام کے احکامات پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ لارڈ کرومر نے سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے کہا تھا کہ "اصلاح شدہ اسلام" اسلام نہیں ہوگا۔ میں اس حد تک تو نہیں جاؤں گی البتہ میں سمجھتی ہوں کہ مسلمانوں کو نبی

کریم ﷺ کے زمانے سے رائج ہر روایت کی اندھا دھند تقلید کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ ایک پاکستانی اسکالر فضل الرحمان کے بقول "زندہ سنت" پر عمل کرنا چاہیے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اسلام کے احیاء اور اصلاح کا آغاز امریکہ یا یورپ سے ہو سکتا ہے؟

پروفیسر شمل: مجھے شک ہے کہ عالمِ اسلام اِس بات کو قبول نہیں کرے گا۔ بلا شبہ امریکی یونیورسٹیوں میں نہ صرف اسلامیات بلکہ تمام مضامین میں مسلمان طلبہ اور پروفیسروں کی تعداد بتدریج بڑھتی جارہی ہے۔ یہی صورت حال یورپی یونیورسٹیوں میں ہے۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں موجود مسلمانوں نے تاخیر سے سہی، احیائے اسلام کے لیے کچھ کام شروع کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر یہ لوگ اِس ضمن میں بھی اہم کردار ادا کر سکیں۔ فی الوقت تو وہ یہ ثابت کرنے میں مصروف ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں بیک وقت اچھا مسلمان اور کامیاب سائنسدان ہونا ممکن ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اسلام میں دین اور سیاست میں باہم کیا رشتہ ہے؟ اگر انسان کے مرتّب کردہ اصول اور سیاسی مقاصد، اسلام کی روحانی بنیادوں کا حصّہ نہیں ہیں؟

پروفیسر شمل: ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں دین اور ریاست ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ۶۲۲ء میں نبی کریم ﷺ مکّہ معظمہ سے مدینہ منوّرہ ہجرت فرمانے کے بعد روایتی معنوں میں محض ایک پیغمبر نہیں رہے تھے، بلکہ آپ ﷺ ایک سیاستدان بھی تھے جنھوں نے وحی الٰہی کی بنیاد پر ایک کامیاب مملکت بھی قائم فرمائی۔

سوال: کیا ایک اسلامی مملکت، مغربی جمہوریت کی طرح مملکت میں مختلف الخیال عناصر کو قبول کرنے اور اُن کا تحفّظ کرنے کی صلاحیّت رکھتی ہے؟

پروفیسر شمل: یقیناً میرا جواب اثبات میں ہے۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد جمہوریت کو اجنبی شے نہیں سمجھتی، کیونکہ قرآن پاک میں "شوریٰ" یعنی معاملات باہم صلاح مشورے سے نمٹانے کا حکم ہے۔ قرآن کی اس سورۃ سے جمہوریت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

سوال: ایک اسلامی مملکت اور معاشرے میں غیر مسلموں کی حیثیّت کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

پروفیسر شمل: قرآن اور اسلامی قانون میں غیر مسلموں کی حیثیت اور مقام کا واضح طور پر تعیّن کر دیا گیا ہے۔ دو بڑے مذاہب کے پیروکاروں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کو "اہلِ کتاب" ہونے کے باعث شروع ہی سے خصوصی مقام حاصل ہے۔ بعد ازاں بدھ، ہندوؤں اور پارسیوں کو بھی یہی مقام دیا گیا ہے۔ اِن مذاہب کے پیروکاروں کو اسلامی حکومت میں ایک خصوصی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ فوجی خدمات

سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں ان کے باہمی تنازعات کا فیصلہ ان کے مذہبی احکامات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ غرض کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی خود مختاری کا تحفظ موجود ہے۔

سوال: لیکن ان تمام مراعات کے باوجود تمام مذاہب کے لیے یکساں حقوق کی صورت میں مکمل رواداری تو نظر نہیں آتی؟

پروفیسر شمل: نہیں۔ اگر شریعت الہیٰ پر مکمل عمل کیا جائے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

سوال: اسلام کے خلاف مغربی ملکوں کے الزامات میں اس پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ اسلام میں خواتین کو کمتر حیثیت حاصل ہے؟

پروفیسر شمل: اسلام کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ میں حتیٰ کہ مستشرقین میں بھی ادھورے علم اور بعض اوقات جہالت کی وجہ سے بے شمار گمراہ کن باتیں پائی جاتی ہیں اور اسلام میں خواتین کی حیثیت و مرتبہ کے بارے میں خاص طور سے بہت غلط خیالات پائے جاتے ہیں۔ یہ بات قطعاً باعث حیرت نہیں کہ مسلمانوں کے کسی ملک میں کوئی خاتون سربراہ حکومت ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں بے نظیر بھٹو اور بنگلہ دیش میں خالدہ ضیاء اس کی واضح مثال ہیں۔ حتیٰ کہ ازمنہ وسطیٰ میں بھی کئی خود مختار خواتین حکمران ہو گزری ہیں۔ یہ بات ہندوستان میں ۱۳ویں سے ۱۹ ویں صدی کے درمیان مسلمانوں کے دور حکومت کی تاریخ سے واضح ہے۔ گویا اسلامی قانون کسی خاتون کے سربراہ حکومت ہونے کی مخالفت نہیں کرتا، البتہ اس قانون کی تعبیر و تشریح پر شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں صرف خلیفہ کا ایسا عہدہ ہے جس پر کوئی خاتون فائز نہیں ہو سکتی۔ خلیفہ سے مراد مسلمانوں کا وہ حقیقی رہنما ہے جو نماز اور جنگ میں لوگوں کی قیادت کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام میں سیاسی امور میں خواتین کا کردار انتظامی عہدے تک محدود ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ گزشتہ صدیوں سے مسلمان خواتین نے بطور شاعر، اسکالر، فنکار خصوصاً خطاطی کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمان خواتین مختلف انداز میں طریقت اور تصوّف پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں یہ حقیقت بہت زیادہ اہمیّت کی حامل ہے کہ قرآن مجید نے ساتویں صدی میں ہی خاتون کو یہ غیر معمولی حق عطا کر دیا تھا کہ وہ نکاح کے بعد والدین کے گھر سے جو مال اسباب یا دولت لے کر آئے یا شادی کے بعد خود کمائے اس پر خالصتاً خاتون کا اختیار ہوگا اور شوہر کو بیوی کی املاک اور جائیداد پر قطعاً کوئی اختیار اور حق حاصل نہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اُس دور میں جبکہ یورپ میں خواتین سراسر مردوں کی محتاج تھیں، اسلام کتنا ترقی پسند دین تھا۔ خواتین کے پہرہ ڈھانپنے اور اُنہیں الگ تھلگ رکھنے کی باتیں بعد میں شامل ہوئیں۔

سوال: آپ اکثر کہتی ہیں کہ جرمن عوام حتیٰ کہ ماہرین بھی عرب اور باقی اسلامی دنیا کے معاملے میں کسی حد تک ناواقفیّت بلکہ جہالت کا مظاہرہ کرتے

ہیں. کیا آپ کی اس بات سے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جرمنی میں عربوں اور اسلام کے مطالعے کی صورتِ حال اطمینان بخش نہیں ہے اور یہ کہ عربوں اور خاص طور سے اسلام کے بارے میں کم علمی کی وجہ یہ ہے کہ جرمنی میں ان شعبوں کی تعلیم کا معیار اعلیٰ اور سائنسی نہیں ہے ؟

پروفیسر شمل: نہیں۔ یہ تصوّر درست نہیں ہے۔ جرمنی ہمیشہ سے ان ملکوں میں سرفہرست ہے جہاں اسلام کا مطالعہ خالصتاً سائنسی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور جہاں اس ضمن میں فلسفے اور تاریخ کا کڑا معیار اپنایا گیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ملک کی مشکلات پر قابو پانے کے بعد اسلامیات کے مطالعے پر خصوصی توجّہ دی گئی۔ میں کئی نوجوان اسکالروں کو جانتی ہوں جو اس میدان میں بہترین کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی کامیابی کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ سرکاری طور پر ان کی مدد بھی کرتی ہوں۔ بیروت کا اور مینٹل انسٹی ٹیوٹ اور استنبول میں اس کی شاخ محض جرمن اسکالروں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ان اداروں نے جو کام کیا ہے اُن کی تعریف کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ مجھے افسوس صرف اس بات پر ہے کہ اردو کا تو ذکر کیا، میرے زمانے کی طرح اب عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا امتزاج بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اسلامی آرٹ کی تاریخ بھی برائے نام پڑھائی جاتی ہے، حالانکہ یورپ میں اس شعبے میں سب سے پہلے توجہ دینے والے دو اسکالر جرمن تھے یعنی فریڈرک سار اور آرنسٹ کونل۔

سوال: کیا یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے بارے میں ہمارے ثقافتی تاثر کو درست کرنے کے لیے جرمن کلاسیکی ادب کو پھر سے مقبول کیا جائے، کیونکہ اُس دور میں جرمن ادب کے ذریعے اسلامی شاعری، علم و ادب اور روحانیّت کو جرمنوں میں متعارف کرایا گیا ؟

پروفیسر شمل: کلاسیکی جرمن ادب کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ عالمِ اسلام کے بارے میں اس کا رویّہ بہت مثبت رہا ہے۔ جرمنوں نے مشرقی ادب سے خصوصاً عربی، فارسی اور ترکی ادب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ شیخ سعدی کی شاہکار تخلیق "گلستان" اور فارسی کے ایک اور بلند پایہ شاعر حافظ کے "دیوان" نے جرمن ادیبوں کو بہت متاثر کیا، خصوصاً گوئٹے دیوان حافظ سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اس کے زیر اثر "مغرب مشرقی دیوان" تصنیف کیا۔ اگر آج کوئی گوئٹے کی تصنیف Noten und Abhand lungen دیکھے تو اسے یہ جان کر بہت خوشگوار حیرت ہوگی کہ گوئٹے کو اسلامی ثقافت اور ادب کا کتنا گہرا ادراک تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ گوئٹے نے کہا تھا کہ "اگر اسلام اللہ کی غیر مشروط اور مکمل اطاعت کا نام ہے تو پھر ہم سب اسلام کے لیے زندہ رہتے اور اسی کے لیے مرتے ہیں۔"

علاوہ ازیں مشہور جرمن شاعر اور ماہر علوم شرقیہ فریڈرک روکروٹ نے عربی، فارسی، سنسکرت اور دیگر درجنوں زبانوں میں دستیاب علمی کاموں کو جرمن میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے قرآن پاک کا بہترین

ترجمہ بھی کیا۔ افسوس کہ وہ پورے کلام پاک کا ترجمہ نہیں کر سکے اور صرف کچھ حصّوں کا ترجمہ کر سکے۔ افسوس کہ ان کے تخلیقی کام کو جو گوئٹے کی خواہش کے مطابق عالمی ادب کا حقیقی نمونہ تھا، اب جرمنی میں زیادہ لوگ نہیں جانتے۔

سوال: پروفیسر شمل! اب میں اسلام کے خالصتاً دینی پہلو کی طرف آتا ہوں. کچھ عرصے سے مغرب کے مذہبی رہنما، علماء اور دانشور مسلمانوں سے مثبت مذاکرات کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں. کیا آپ کے خیال میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذاکرات کے ٹھوس امکانات ہیں؟

پروفیسر شمل: جی ہاں، ٹھوس امکانات موجود ہیں لیکن اب تک ایسے مذاکرات کے نتیجے میں تین، چار یا پانچ بڑے مذاہب کی نظری بنیادیں موضوع بحث رہی ہیں جس سے دینیاتی تعریف اور بنیادی باتوں میں الجھاؤ پیدا ہوا۔ عملی زہد و تقویٰ اور خدا پرستی کا معاملہ عموماً بحث کے دائرے سے باہر ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اس سلسلے میں اسلامی تصوّف در حقیقت کتنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے. جس کا اثر و رسوخ مغرب میں بڑھتا جا رہا ہے؟

پروفیسر شمل: یہ حقیقت صرف مغرب تک محدود نہیں ہے۔ مختلف ممالک میں مسلمانوں میں تصوّف کی لہر بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں تصوّف کی لہریں ہمیشہ سے موجود ہیں، البتہ کچھ علماء تصوّف، خاص طور سے اس کے ذیلی سلسلوں کے نکتہ چین رہے ہیں۔ بھارت اور پاکستان میں تصوّف کے بغیر اسلام کا تصوّر بھی مشکل ہے۔ ان خطّوں میں اسلام تلوار و تفنگ کے زور سے نہیں بلکہ صوفیاء کی پُرخلوص کوششوں اور محبت آمیز سلوک کی وجہ سے پھیلا ہے۔ تقریباً سو برس قبل ۱۸۹۶ء میں سر آرنلڈ ٹامس نے "تبلیغِ اسلام" کے نام سے بہترین کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے واضح کیا تھا کہ صوفیاء کرام اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ سے محبت، انسان سے محبت اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کا درس دیتے تھے۔ وہ لوگ کٹرپن سے بہت دور تھے۔ تصوّف اور صوفیاء کے اُس کردار کی آج بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اب یورپ میں تصوّف کے سلسلے بڑھتے جا رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عیسائیت اور جدید دنیا سے لوگوں کی مایوسی بڑھتی جا رہی ہے اور ایسے لوگ عموماً اسلام اور تصوّف کے سائے میں پناہ لے رہے ہیں۔ بلاشبہ ان میں سے کچھ سلسلوں پر مغربیّت کا رنگ غالب ہے جس کی وجہ سے ان میں روحانیّت کا عنصر کمزور پڑ گیا ہے۔ اس میں خطرے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے بہت سے گروپ خود کو صوفی گردانتے ہیں۔ صوفیانہ کلام پڑھتے اور دھمال ڈالتے ہیں، لیکن وہ اسلام کے حقیقی علم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ وہ لوگ صوفیوں کے بعض ظاہری اطوار اپنا لینے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے یکسر لاعلم ہیں کہ تصوّف کا راستہ بہت مشکل اور کٹھن اور سخت ریاضت اور زہد و تقویٰ کا

متقاضی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کا ایک رخ اپنانے سے بات بن جائے۔ زندگی کے تمام معمولات کو تصوّف کے رنگ میں رنگنا پڑتا ہے، بہرحال مغرب میں تصوّف میں اس تصرف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مغرب کے لوگ اپنے اندرونی تضادات سے نجات پانے کے لیے ایسی راہوں کی تلاش میں ہیں جو انہیں روحانی سکون و اطمینان کی منزل تک پہنچا سکیں۔

سوال: آثار سے ظاہر ہے کہ ترکِ وطن کے ذریعے یورپ میں مسلمانوں کی آمد سے ۲۰۰۰ء تک یورپ میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہو جائے گی۔ مغربی یورپی ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافے کے نتائج و اثرات کیا ہوں گے؟

پروفیسر شمل: اس کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ مسلمان ان ملکوں کے مخصوص ثقافتی ماحول میں کس طرح رہتے سہتے ہیں۔ جرمنی کی مثال لیجیے۔ مختلف پیشوں اور شعبوں میں ترک مسلمانوں کی تعداد حیرت انگیز ہے۔ ترک مسلمان صرف محنت مشقت کے نچلے اور درمیانہ درجے کے شعبوں سے ہی وابستہ نہیں ہیں، بلکہ وہ فنکار بھی ہیں، ڈاکٹر اور موسیقار بھی ہیں۔ اگر حقیقی حالات وہی ہیں جیسے کہ سامنے نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جرمن معاشرے میں اچھی طرح رچ بس گئے ہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں نے خود کو اپنے خول میں بند رکھا اور وہ مقامی لوگوں سے الگ تھلگ رہے تو مستقبل میں شدید مسائل پیدا ہوں گے۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ نوجوان مسلمانوں کے والدین جنہیں اپنے آبائی وطن اور علاقوں میں ان کی اپنی ثقافت اور مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب اور ثقافت سے واسطہ نہیں پڑا تھا، وہ اپنے بچوں کو جدید رجحانات اپنانے اور دوسرے لوگوں میں گھلنے ملنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ لیکن میں اس بارے میں خاصی پُرامید ہوں کہ ربط ضبط لازماً بڑھے گا۔ دوسری جانب جرمنی، فرانس، ہالینڈ یا کسی اور یورپی ملک میں آباد انتہائی تعلیم یافتہ ترک ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دو دنیاؤں کے بیچ رہ رہے ہیں۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک کوشش کرے تو تعصّبات، غلط فہمیاں اور باہمی تفریق ختم ہو سکتی ہے۔ ہم سب کو اس سلسلے میں انفرادی سطح پر بھی کوششیں کرنی چاہییں۔ ہماری کوشش کا دائرہ خواہ کتنا مختصر کیوں نہ ہو، ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ ہم، ترک مسلمانوں اور ان کی ثقافت اور مذہب سے کوئی بَیر نہیں رکھتے۔ ہماری یہ کوشش مفاہمت کی جانب پہلا قدم ہوگی اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ہمارے اس عمل کی پذیرائی کی جائے گی اور اسے سراہا جائے گا۔